تمہارے اور ہمارے درمیان مذہب کی دیوار کھڑی ہے۔ اس محبت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ تم اپنے ساتھ اس کو بھی لے ڈوبو گی اور میری دیرینہ تمناؤں کو خاک میں ملا دو گی۔ میں وہ نے کو ایسا انسان بنانا چاہتی ہوں جس پر قوم کو فخر ہو۔ جس کے دل میں لگن ہو، ہمت ہو، استقلال ہو۔ جو خطرات کے سامنے منہ نہ موڑے۔ جو قوم کی خدمت کے لیے ہمیشہ سر کو ہتھیلی پر لیے رہے۔ جس میں نفس پروری کا شائبہ بھی نہ ہو۔ جو خود کو دھرم پر قربان کر دے۔ میں اسے سپوت بیٹا، وفادار دوست اور بے غرض خادم بنانا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کی شادی کا شوق نہیں۔ اپنے پوتوں کو گود میں کھلانے کی خواہش نہیں۔ ملک میں نفس پرست مردوں اور اولاد پرست عورتوں کی کمی نہیں۔ زمین ان کے بوجھ سے دبی جاتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو سچا راجپوت بنانا چاہتی ہوں۔ آج وہ کسی کی حفاظت کے لیے اپنی جان دے دے تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب ماں دنیا میں نہ ہوگی۔ تم میرے اس سنہرے خواب کو پریشان کر رہی ہو۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں صوفی! اگر تمہارے احسانات کے بوجھ سے دبی نہ ہوتی تو تمہیں اس حالت میں زہر دے کر راستہ سے ہٹا دینا اپنا فرض سمجھتی۔ میں راجپوتنی ہوں۔ مرنا بھی جانتی ہوں اور مارنا بھی۔ اس سے قبل کہ وہ نے سے تمہیں خط و کتابت کرتے دیکھوں، میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گی۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ وہ نے کو اپنے دام محبت میں پھنسانے کی کوشش نہ کرو ورنہ اس کا نتیجہ برا ہوگا۔ تمہیں ایشور نے فہم و فراست عطا کی ہے۔ عقل سے کام لو میرے خاندان کو یک لخت تباہ مت کرو۔"

صوفی نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے اجازت دیجیے۔ آج یہاں سے چلی جاؤں۔"

رانی کچھ نرم ہو کر بولیں۔ "میں تمہیں جانے کو نہیں کہتی۔ تم میرے سر آنکھوں پر رہو (نادم ہو کر) میری زبان سے اس وقت جو ثقیل الفاظ نکلے ہیں، ان کے لیے مجھے

معاف کر دو۔ بڈھے آدمی زود رنج ہوتے ہیں۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ شوق سے رہو۔ ونے اب شاید پھر نہ آئے گا۔ ہاں وہ شیر کا مقابلہ کر سکتا ہے پر میرے غصہ کا مقابلہ نہیں۔ وہ جنگلوں کی خاک چھانے گا لیکن اب گھر نہ آئے گا۔ اگر تمہیں اس سے محبت ہے تو اپنے کو اس کی بہبود کی خاطر قربان کرنے کو تیار رہو جاؤ۔ اب اس کی سلامتی کی صرف ایک ہی تدبیر ہے۔ جانتی ہو وہ کیا ہے؟''

صوفی نے سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں۔''

رانی: جاننا چاہتی ہو؟

صوفی نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔''

رانی: قربانی کے لیے تیار ہو؟

صوفی نے پھر سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔''

رانی: تو تم کسی قابل شخص سے شادی کر لو۔ ونے کو دکھا دو کہ تم اسے بھول گئیں۔ تمہیں اس کی فکر نہیں ہے۔ یہی مایوسی اس کو بچا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مایوسی اس کو زندگی سے بیزار کر دے۔ وہ گیان کے حصول کا سہارا لے جو مایوسی کی واحد جائے پناہ ہے، لیکن ایسا امکان ہونے پر بھی اس کے سوا دوسری تدبیر نہیں ہے۔ تم منظور کرتی ہو؟

صوفی رانی کے پروں پر گر پڑی اور روتی ہوئی بولی۔ ''ان کی بہتری کے لیے..کر سکتی ہوں۔''

رانی نے صوفی کو اٹھا کر گلے لگا لیا اور رقت آمیز لہجہ میں بولیں۔ ''میں جانتی ہوں تم ان کے لیے سب کچھ کر سکتی ہو۔ ایشور تمہیں اس عہد کو پورا کرنے کی طاقت عطا کریں۔''

یہ کہہ کر رانی جانہوی وہاں سے چلی گئیں۔ صوفی ایک کوچ پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔ اس کا بال بال پشیمانی سے تکلیف پا رہا

تھا۔ اسے رانی پر غصہ نہ تھا۔ اسے ان پر بے حد اعتقاد تھا۔ کتنا بلند اور پاک مقصد ہے؟ دراصل میں ہی دودھ کی مکھی ہوں اور مجھی کو نکل جانا چاہیے، لیکن رانی کا آخری حکم اس کے لیے تلخ ترین لقمہ تھا۔ وہ جوگن بن سکتی تھی لیکن محبت کو بدنام کرنے کے خیال ہی سے اس کو نفرت ہوتی تھی۔ اس کی حالت اس فقیر کی سی تھی، جو کسی باغ میں سیر کرنے جائے اور پھل توڑنے کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔ ونے کے ایثار نے اسے ان کا عقیدت مند بنا دیا۔ عقیدت نے جلد ہی محبت کی شکل اختیار کر لی اور اب وہی محبت اس کو جبراً دوزخ کی تاریکی کی طرف کھینچے لیے جا رہی تھی! اگر وہ ہاتھ پیر چھڑاتی ہے تو خوف ہے... وہ اس کے آگے کچھ نہ سوچ سکی۔ سوچنے کی طاقت زائل ہو گئی۔ سارے تفکرات، ساری پشیمانیاں، ساری مایوسی، ساری تکلیف ایک دم سر میں سما کر غائب ہو گئیں!

شام ہو گئی تھی۔ صوفیہ من مارے اداس بیٹھی ہوئی باغ کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی جیسے کوئی بیوہ اپنے خاوند کے سوگ میں محو ہو۔ یکا یک پربھوسیوک کمرہ میں داخل ہوئے۔

صوفیہ نے پربھوسیوک سے کوئی بات نہ کی۔ چپ چاپ اپنی جگہ پر بت بنی بیٹھی رہی۔ وہ اس حالت میں پہنچ گئی تھی جب ہمدردی سے بھی رغبت نہیں باقی رہتی۔ ناامیدی کا آخری درجہ ترک تعلق ہے۔

لیکن پربھوسیوک اپنی نئی تصنیف سنانے کے لیے اس قدر بیتاب تھے کہ صوفی کے چہرہ کی طرف ان کا دھیان ہی نہ گیا۔ آتے ہی بولے۔ ''صوفی! دیکھو۔ آج رات میں نے یہ نظم لکھی ہے۔ ذرا غور سے سننا۔ میں نے ابھی کنور صاحب کو سنائی۔ وہ نہایت محظوظ ہوئے۔''

یہ کہہ کر پربھوسیوک نے شیریں بیانی کے ساتھ اپنی نظم پڑھنی شروع کی۔ شاعر نے اس دارفانی کے ایک غمزدہ دل کے وہ جذبات منظور کیے تھے جو ستاروں کو دیکھ کر اس

میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک شعر جھوم جھوم کر پڑھتے تھے اور اس کو دو دو تین تین بار دہراتے تھے، لیکن صوفیہ نے ایک بار بھی داد نہ دی۔ گویا اس میں سخن فہمی کا احساس باقی نہیں رہا تھا۔ نظم کو ختم کر کے پربھوسیوک نے پوچھا۔ ''اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟''

صوفیہ نے کہا۔ ''اچھی تو ہے۔''

پربھوسیوک: میرے اشعار پر تم نے دھیان نہیں دیا۔ آج تک کسی شاعر نے بھی ستاروں کو ملائک کی ارواح سے تشبیہ نہیں دی ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ اس نظم کی اشاعت ہوتے ہی شعراء کی جماعت میں ہلچل پیدا ہو جائے گی۔

صوفیہ: مجھے تو یاد آتا ہے کہ شیلی اور ورڈسورتھ اس استعارہ کو پہلے ہی استعمال کر چکے ہیں۔ یہاں کے شاعروں نے بھی کچھ ایسے ہی استعارے باندھے ہیں۔ شاید ہیوگو کی ایک نظم کا عنوان بھی یہی ہے۔ ممکن ہے تمہارا تخیل ان کے تخیل سے لڑ گیا ہو۔

پربھوسیوک: میں نے استادوں کا کلام تم سے زیادہ دیکھا ہے، لیکن یہ تشبیہ مجھ کو کہیں بھی نہیں دکھائی دی۔

صوفیہ: خیر، ہو سکتا ہے مجھی کو یاد نہ ہو گا۔ نظم بری نہیں ہے۔

پربھوسیوک: اگر کوئی دوسرا شاعر یہ اعجاز پیدا کرے تو اس کی غلامی کرنے کو تیار ہوں۔

صوفیہ: تو میں کہوں گی کہ تمہاری نگاہ میں اپنی آزادی کی قیمت بہت زیادہ نہیں ہے۔

پربھوسیوک: تو میں بھی یہی کہوں گا کہ سخن فہمی میں کمال حاصل کرنے کے لیے ابھی تمہیں بہت زیادہ مشق کی ضرورت ہے۔

صوفیہ: مجھے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ اہم کام کرنے ہیں۔ آج کل گھر کی کیا کیفیت ہے؟

پربھوسیوک: وہی پرانی کیفیت۔ میں تو عاجز آ گیا ہوں۔ پاپا کو اپنے کارخانہ کی دھن لگی ہوئی ہے اور مجھے اس کام سے نفرت ہے۔ پاپا اور ماما دونوں ہر وقت جھنجھناتے رہتے ہیں۔ کسی کا منہ سیدھا ہی نہیں ہوتا۔ کہیں ٹھکانا نہیں ملتا ورنہ اس حرص کے آشیانے میں ایک منٹ بھی نہ رہتا۔ کہاں جاؤں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

صوفیہ: بڑے تعجب کی بات ہے۔ اس قدر عالم اور ہنرمند ہو کر بھی تمہیں اپنی گزر بسر کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ شاید تخیل کی دنیا میں خودداری کے لیے کہیں بھی جگہ نہیں۔

پربھوسیوک: صوفی! میں اور سب کچھ کر سکتا ہوں مگر خانگی تفکرات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ میں بےفکر، آزاد اور بےلوث رہنا چاہتا ہوں۔ ایک خوشنما باغ میں کسی گھنے درخت کے نیچے چڑیوں کے نغمے سنتا ہوا فکر شعر میں محو ہو کر پڑا رہوں۔ یہی میری زندگی کا معیار ہے۔

صوفیہ: تمہاری زندگی اسی طرح خواب دیکھنے میں گزرے گی۔

پربھوسیوک: کچھ ہو۔ فکر سے نجات حاصل ہے۔ آزاد تو ہوں۔

صوفیہ: جہاں ضمیر اور اصولوں کا خون ہوتا ہے، وہاں سے آزادی کوسوں دور بھاگتی ہے۔ میں اس کو آزادی نہیں کہتی۔ یہ بےحیائی ہے۔ والدین کی بےرحمی کم تکلیف دہ نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کا ظلم اتنا ناقابل برداشت نہیں ہوتا جتنا کہ والدین کا۔

پربھوسیوک: اونہہ۔ دیکھا جائے گا۔ سر پر جو پڑے گی، جھیل لوں گا۔ مرنے سے پہلے ہی کیوں روؤں؟

یہ کہہ کر پربھو نے پانڈے پور کا واقعہ بیان کیا اور اتنی ڈینگیں ماریں کہ صوفی چڑ کر بولی۔ ''رہنے بھی دو ایک گنوار کو پیٹ لیا تو کون سا بڑا کام کیا۔ اپنی نظموں میں تو عدم تشدد کا مجسمہ بن جاتے ہو اور وہاں ذرا سی بات پر اتنا جامہ سے باہر ہو گئے۔''

پربھوسیوک: گالی سہہ لیتا؟

صوفیہ: جب تم مارنے والے کو بھی مارو گے۔ گالی دینے والے کو بھی مارو گے تو عدم تشدد والے اصول پر کاربند کب ہو گے۔ راہ چلتے تو کسی کو کوئی نہیں مارتا۔ واقعی کسی نوجوان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ نصیحت کرے۔ خواہ اس کی شاعرانہ قوت کتنی ہی زبردست ہو۔ نصیحت کرنا مشاق اور پختہ کار لوگوں ہی کا کام ہے۔ یہ نہیں کہ جس کو ذرا بھی تک بندی آ گئی وہ لگا امن، برداشت اور عدم تشدد کا سبق پڑھانے! جو بات دوسروں کو سکھلانا چاہتے ہو وہ پہلے خود تو سیکھ لو۔

پربھوسیوک: ٹھیک یہی بات ونے نے بھی اپنے خط میں لکھی ہے۔ لو یاد آ گیا۔ یہ تمہارا خط ہے۔ مجھے یاد ہی نہیں رہی تھی۔ یہ تذکرہ نہ چھڑ جاتا تو جیب میں رکھے ہی لوٹ جاتا۔

یہ کہتے ہوئے پربھوسیوک نے ایک لفافہ نکال کر صوفیہ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ صوفیہ نے پوچھا۔ ''آج کل کہاں ہیں؟''

پربھوسیوک: اودے پور کے کوہستانی علاقوں میں گھوم رہے ہیں۔ میرے نام جو خط آیا ہے اس میں تو انہوں نے صاف لکھا ہے کہ میں اس خدمتی کام کے بالکل نا قابل ہوں۔ مجھ میں اتنی قوت برداشت نہیں جتنی ہونی چاہیے۔ شباب کا زمانہ تجربہ حاصل کرنے کا زمانہ ہے۔ پختہ عمری ہی میں کارہائے عامہ میں شامل ہونا چاہیے۔ کسی جوان کو خدمتی کام کرنے کے لیے بھیجنا ویسا ہی ہے جیسے کسی کمسن طبیب کو مریض کی تکلیف رفع کرنے کے لیے بھیجنا۔

پربھوسیوک چلے گئے تو صوفیہ سوچنے لگی۔ یہ خط پڑھوں یا نہ پڑھوں۔ ونے اس کو رانی صاحبہ سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ یہیں کے پتہ پر نہ بھیجتے۔ میں نے ابھی رانی صاحبہ سے وعدہ کیا ہے کہ ان سے خط و کتابت نہ کروں گی۔ اس خط کو کھولنا روا نہیں۔ رانی صاحبہ کو دکھا دوں۔ اس سے ان کے دل میں میری طرف سے جو

بدگمانی ہے وہ دور ہو جائے گی۔ مگر معلوم نہیں۔ کیا باتیں لکھی ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسی بات ہو جو رانی کے غصہ کو اور بھی تیز کر دے۔ نہیں۔ اس خط کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہیے۔ رانی کو سکھانا درست نہیں۔

اس نے پھر سوچا۔ پڑھنے سے کیا فائدہ۔ نہ جانے میرے دل کی کیا کیفیت ہو۔ مجھے اب اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا۔ اب اس محبت کے پودے کو بیخ و بن، سے اکھاڑنا ہی ہے تو اسے کیوں سینچوں۔ اس خط کو رانی کے حوالہ کر دینا ہی مناسب ہے۔

صوفیہ نے اور زیادہ سوچ بچار نہ کیا۔ شک ہوا کہ کہیں میں اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکوں۔ چھلنی میں پانی نہیں ٹھہرتا۔

اس نے اسی وقت وہ خط لے جا کر رانی کو دے دیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کس کا خط ہے؟ یہ تو ونے کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ تمہارے نام آیا نا؟ تم نے لفافہ کھولا نہیں؟

صوفیہ: جی نہیں۔

رانی نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ اسے پڑھو۔ تم نے اپنا قول نباہا ہے۔ اس سے میں خوش ہوں۔''

صوفیہ: مجھے معاف کیجیے۔

رانی: میں خوشی سے کہتی ہوں۔ پڑھو۔ دیکھو کیا لکھتے ہیں۔

صوفیہ: جی نہیں۔

رانی نے خط جوں کا توں صندوق میں بند کر دیا۔ خود بھی نہیں پڑھا۔ کیونکہ ایسا کرنا آئین آداب کے خلاف تھا۔ پھر صوفیہ سے بولی۔ ''بیٹی! اب میری تم سے ایک التجا اور ہے۔ وونے کو خط لکھو اور اس میں صاف لکھ دو کہ ہماری اور تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ آئندہ ہم دونوں میں صرف بھائی بہن کا تعلق رہے۔ تمہارے خط سے یہ ظاہر ہونا چاہیے کہ تم ان کی محبت کے بہ نسبت ان کے قومی جذبات کی زیادہ قدر کرتی ہو۔ تمہارا یہ خط میرے اور ان کے والد کے ہزاروں نصائح سے زیادہ موثر ہوگا۔ مجھے

یقین ہے کہ تمہارا خط پاتے ہی ان کی طبیعت بدل جائے گی اور وہ فرض کے راستہ پر مستعدی سے گامزن ہوں گے۔ میں اس مہربانی کے لیے تمام عمر تمہاری ممنون رہوں گی۔'' صوفیہ نے مغموم لہجہ میں کہا۔ ''آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گی۔''

رانی: نہیں۔ صرف میرے ارشاد کی تعمیل کافی نہیں ہے۔ اگر یہ ظاہر ہوا کہ کسی ترغیب سے لکھا گیا ہے تو اس کا اثر جاتا رہے گا۔

صوفیہ: آپ کو خط لکھ کر دکھلا دوں؟

رانی: نہیں۔ تمہی بھیج دینا۔

صوفیہ جب وہاں سے آ کر خط لکھنے بیٹھی تو اس کو سوجھتا ہی نہ تھا کہ کیا لکھوں۔ سوچنے لگی۔ وہ مجھے بے درد خیال کریں گے۔ اگر لکھ دوں کہ میں نے تمہارا خط پڑھا ہی نہیں تو انہیں کتنا رنج ہوگا۔ کیسے کہوں کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔

وہ میز پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور طے کر لیا کہ کل لکھوں گی۔ ایک کتاب پڑھنے لگی۔ کھانے کا وقت آ گیا۔ نو بج گئے۔ ابھی وہ منہ ہاتھ دھو کر بیٹھی تھی کہ اس نے رانی کو دروازہ سے اندر کی طرف جھانکتے دیکھا۔ سمجھی کہ کسی کام سے جا رہی ہوں گی۔ پھر کتاب دیکھنے لگی۔ پندرہ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ رانی پھر دوسری طرف سے لوٹیں اور انہوں نے کمرہ میں پھر جھانکا۔

صوفیہ کو ان کا اس طرح منڈلانا نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ اس نے سمجھا۔ ''یہ مجھے بالکل کاٹھ کی پتلی بنانا چاہتی ہیں کہ بس ان کے اشاروں پر ناچا کروں۔ اتنا تو نہ ہو سکا کہ جب میں نے بند لفافہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا تو مجھے خط پڑھ کر سنا دیتیں۔ آخر میں لکھوں کیا؟ نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے خط میں کیا لکھا ہے؟ دفعتاً اس کو خیال ہوا کہ میرا خط نصیحت کی شکل نہ اختیار کرے۔ وہ اسے پڑھ کر شاید مجھ سے چڑ جائیں۔ اپنے محبت کرنے والوں سے ہم سبق و نصیحت کی باتیں نہیں بلکہ محبت اور دل دہی کی باتیں سننا چاہتے ہیں۔ بڑی خیریت ہوئی۔ ورنہ وہ میری نصیحت آمیز

تحریر کو پڑھ کر نہ جانے اپنے دل میں کیا سمجھتے۔ انہیں خیال ہوتا کہ گرجا میں وعظ سنتے سنتے اس کے جذبات محبت افسردہ و بے حس ہو گئے ہیں۔ اگر وہ مجھے ایسا خط لکھتے تو مجھے کتنا برا معلوم ہوتا۔ آہ میں نے بڑا دھوکا کھایا۔ پہلے میں نے سمجھا تھا کہ ان سے صرف روحانی محبت کروں گی۔ اب معلوم ہو رہا ہے کہ روحانی محبت یا عقیدت صرف مذہبی دنیا کے لیے مخصوص ہے۔ عورت اور مرد میں پاک محبت ہونی غیر ممکن ہے۔ محبت پہلے انگلی پکڑ کر فوراً پہنچا پکڑتی ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ محبت مجھے علم حقیقی کے بلند ترین معیار سے نیچے گرا رہی ہے۔ ہم کو زندگی اس لیے عطا کی گئی ہے کہ پاکیزہ خیالی اور نیک اعمالی سے اس کو اونچے مدارج پر پہنچائیں۔ یہاں تک کہ ایک روز نور ازلی میں محو ہو کر نیست ہو جائیں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ زندگی فانی ہے۔ چند روزہ ہے اور دنیا کی ساری مسرتیں بھی فانی اور چند روزہ ہیں۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی پروانہ کی طرح شمع پر گر رہی ہوں۔ اسی لیے کہ محبت میں وہ بے خودی ہے کہ جو عقل، احتیاط اور ارادہ پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اہل تصوف بھی جو روحانی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ خواہشات نفسانی سے مبرا نہیں رہ سکتے۔ جیسے کوئی جبراً کھینچے لیے جا رہا ہو۔ اس کو جانے سے منع کرنا کتنی بڑی بے انصافی ہے۔''

دکھی لوگوں کے لیے رات ایک کٹھن تپسیا سے کم نہیں ہے۔ جوں جوں رات گزرتی تھی۔ صوفی کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ آدھی رات تک اپنے اندرونی جذبات سے لگاتار مقابلہ کرنے کے بعد اس نے بالآخر مجبور ہو کر اپنے دل کے دروازے عشق و محبت کی خوش فعلیوں کے لیے کھول دیئے۔ جیسے کسی تماشا کا منیجر تماشائیوں کی کثرت سے تنگ آ کر تماشا گاہ کو عوام کے لیے کھول دیتا ہے۔ باہر کا شور اندر کی نغمہ سرائیوں میں مخل ہوتا ہے۔ صوفی نے اپنے کو عشقیہ خیالات کی گود میں ڈال دیا اور بلا کسی ہچک یا رکاوٹ کے ان خیالات سے یوں لطف اندوز ہونے لگی۔ کیوں و نے تم

میرے لیے کیا کیا مصیبتیں جھیلو گے! بے عزتی، ذلت، نفرت، والدین کی مخالفت، تم میرے لیے یہ سب باتیں سہہ لو گے؟ لیکن مذہب؟ وہ دیکھو تمہارا چہرہ اداس ہو گیا۔ تم سب کچھ کرو گے۔ پر مذہب نہیں ترک کر سکتے۔ میری بھی یہی کیفیت ہے۔ میں تمہارے ساتھ فاقہ کر سکتی ہوں۔ ذلت، حقارت، رسوائی سب برداشت کر سکتی ہوں۔ پر مذہب کو کس طرح ترک کروں؟ یسوع کا دامن کیسے چھوڑ دوں؟ عیسائیت کی مجھے پروا نہیں۔ یہ صرف خود غرضیوں کا ایک مجموعہ ہے لیکن اس مقدس روح سے کیونکر منحرف ہو سکتی ہوں جو سراپا عفو و رحم تھی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں یسوع کے دامن سے وابستہ رہ کر بھی اپنی محبت کی خواہشات کو آسودہ کر سکوں۔ ہندو مذہب کے وسیع دامن میں کس کے لیے گنجائش نہیں۔ خدا کا ماننے والا بھی ہندو ہے۔ نہ ماننے والا بھی ہندو ہے۔ ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کا ماننے والا بھی ہندو ہے۔ جہاں مہاویر کے بھگتوں کے لیے جگہ ہے۔ مہاتما بدھ کے بھگتوں کے لیے جگہ ہے وہاں، کیا عیسیٰ کے بھگتوں کے لیے جگہ نہیں ہے۔ تم نے مجھے محبت کی نوید دی ہے۔ میں اس کو نامنظور کیوں کروں۔ میں بھی تمہارے ساتھ خدمتی کاموں میں مشغول ہو جاؤں گی۔ تمہارے ساتھ جنگلوں میں پھروں گی۔ جھونپڑیوں میں رہوں گی! آہ۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں نے وہ خط رانی صاحبہ کو ناحق دے دیا۔ میرا خط تھا۔ مجھے اس کے پڑھنے کا پورا حق تھا۔ میرے اور ان کے درمیان میں محبت کا رشتہ ہے، جو دنیا کے اور سبھی رشتوں سے پاکیزہ اور افضل ترین ہے۔ میں اس بارے میں اپنے حق سے دست بردار ہو کرونے کے ساتھ ناانصافی کر رہی ہوں۔ نہیں میں ان سے دغا کر رہی ہوں میں محبت کو بدنام کر رہی ہوں۔ اور ان کے دلی جذبات کا مضحکہ اڑا رہی ہوں۔ وہ میرا خط پڑھے بغیر ہی پھاڑ کر پھینک دیتے تو مجھے اتنا رنج ہوتا کہ انہیں کبھی معاف نہ کرتی۔ کیا کروں؟ جا کر رانی صاحبہ سے وہ خط مانگ لوں؟ اسے دینے میں ان کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دل میں خواہ کتنا ہی برا مانیں، پر میری

امانت مجھے ضرور لوٹا دیں گی۔ وہ میری ماما کی طرح تنگ دل نہیں ہیں۔ مگر ان سے مانگوں کیوں۔ وہ تو میری چیز ہے۔ کسی اور شخص کا اس پر ذرا بھی اختیار نہیں۔ اپنی چیز لے لینے کے لیے میں کسی دوسرے کی احسان مند کیوں بنوں۔

گیارہ بج رہے تھے۔ گھر میں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نوکر چاکر سب سو گئے تھے۔ صوفیہ نے کھڑکی سے باہر باغ کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے دودھ کی بارش ہو رہی ہے۔ چاندنی خوب چھٹک رہی تھی۔ سنگ مرمر کی دونوں پریاں جو حوض کے کنارے کھڑی تھیں، اس خاموش نغمہ کی نورانی مورتیں سی معلوم ہوتی تھیں جس سے سارا منظر معمور تھا۔

صوفیہ کے دل میں زبردست خواہش ہوئی کہ اسی وقت چل کر اپنا خط لاؤں۔ وہ پختہ ارادہ کر کے اپنے کمرہ سے نکلی اور بے خوفی کے ساتھ رانی صاحبہ کے دیوان خانہ کی طرف چلی۔ وہ اپنے دل کو بار بار سمجھا رہی تھی۔ مجھے خوف کس کا ہے۔ اپنی چیز لینے جا رہی ہوں۔ کوئی پوچھے تو اس سے صاف صاف کہہ سکتی ہوں۔ و نے سنگھ کا نام لینا کوئی جرم نہیں ہے۔

مگر لگاتار تشفی ملنے پر بھی اس کے قدم اتنی احتیاط سے پڑتے تھے کہ برآمدہ کے پختہ فرش پر بھی کوئی آہٹ نہ ہوتی تھی۔ اس کے چہرہ سے وہ بے اطمینانی ظاہر ہو رہی تھی جو نیت فاسد کا نشان ہے۔ وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے دہنے بائیں آگے پیچھے تاکتی جاتی تھی۔ ذرا سا بھی کوئی کھٹکا ہوتا تو اس کے پیر خود بخود رک جاتے تھے اور برآمدہ کے ستونوں کی آڑ میں چھپ جاتی تھی۔ راستہ میں کئی کمرے تھے۔ اگرچہ ان میں تاریکی تھی اور روشنی گل ہو چکی تھی تاہم وہ دروازہ پر ایک لمحہ کے لیے رک جاتی تھی کہ کوئی ان میں بیٹھا ہو۔ دفعتاً ایک ٹیریر کتا جسے رانی صاحبہ بہت پیار کرتی تھیں، سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ صوفی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے ذرا بھی منہ کھولا کہ سارے مکان میں ہل چل ہو جائے گی۔ کتے نے اس کی طرف مشتبہ

نگاہوں سے دیکھا اور اپنے فیصلہ کا اظہار کرنا ہی چاہتا تھا کہ صوفیہ نے آہستہ سے اس کا نام لیا اور اسے گود میں اٹھا کر اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ کتا دم ہلانے لگا لیکن اپنی راہ جانے کے بجائے وہ صوفیہ کے ساتھ ہولیا۔ شاید اس کی فطرت بتلا رہی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس طرح پانچ کمروں کے بعد رانی صاحبہ کا دیوان خانہ ملا۔ اس کے دروازے کھلے تھے، لیکن اندر اندھیرا تھا۔ کمرہ میں بجلی کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ انگلیوں کی بہت خفیف حرکت سے کمرہ روشن ہوسکتا تھا مگر اس وقت بٹن کا دبانا اسے بارود کے ڈھیر میں دیا سلائی لگانے سے کم خطرناک نہ معلوم ہوتا تھا۔ روشنی سے وہ کبھی اس قدر خوف زدہ نہ ہوئی تھی۔ مشکل تو یہ تھی کہ روشنی کے بغیر وہ اپنے ارادہ میں کامیاب بھی نہ ہوسکتی تھی۔ وہی آب حیات بھی تھی اور زہر ہلاہل بھی۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ کواڑوں میں شیشے کیوں لگے ہوئے ہیں۔ پردے ہیں تو بھی اس قدر باریک کہ آدمی کا منہ دکھائی دیتا ہے۔ گھر نہ ہوا کوئی سجی ہوئی دکان ہوئی۔ بالکل انگریزی نقل ہے اور روشنی ٹھنڈی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے تو کوئی بہت بڑی کفایت نہیں ہو جاتی۔

ہم جب کسی تنگ سڑک پر چلتے ہیں تو ہمیں سواریوں کا آنا جانا بہت ہی تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان راستوں پر سواریوں کی آمد و رفت کی روک ہونی چاہیے۔ ہمارا اختیار ہوتا تو ان سڑکوں پر کوئی سواری نہ گزرنے دیتے خصوصاً موٹروں کو، لیکن انہیں سڑکوں پر جب ہم کسی سواری پر بیٹھ کر چلتے ہیں تو قدم قدم پر مسافروں کو ہٹانے کے لیے رک جانے پر جھنجھلاتے ہیں کہ یہ سب پٹری پر کیوں نہیں چلتے۔ خواہ مخواہ بیچ میں دھنسے پڑتے ہیں۔ مشکلات میں پڑ کر گرد و پیش کے حالات پر ناخوشی کا اظہار کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔

صوفیہ کئی منٹ تک بجلی کے بٹن کے پاس کھڑی رہی۔ بٹن دبانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ سارے صحن میں روشنی پھیل جائے گی۔ لوگ چونک پڑیں گے۔

اندھیرے میں سوتا ہوا آدمی بھی اجالا پھیلتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ مجبوراً اس نے میز کو ٹٹولنا شروع کیا۔ دوات لڑھک گئی۔ سیاہی میز پر پھیل گئی اور اس کے کپڑوں پر داغ پڑ گئے۔ اسے یقین تھا کہ رانی نے خط کو اپنے ہینڈ بیگ (دستی بیگ) میں رکھا ہوگا۔ ضروری خطوط اسی میں رکھتی تھیں۔ بڑی مشکل سے اس کو بیگ ملا۔ وہ اس میں سے ایک ایک خط نکال کر اندھیرے میں دیکھنے لگی۔ لفافے زیادہ تر ایک ہی قسم کے تھے۔ نگاہیں کچھ کام سے نہ کر سکیں۔ آخر اس طرح مطلب برآری ہوتے نہ دیکھ کر اس نے بیگ کو اٹھا لیا اور کمرہ سے باہر نکلی۔ سوچا کہ میرے کمرہ میں ابھی تک روشنی ہے وہاں وہ خط بآسانی مل جائے گا۔ اسے لا کر بھی پھر یہیں رکھ دوں گی، لیکن واپس ہوتے وقت وہ اتنی ہوشیاری سے قدم نہ اٹھا سکی۔ آتے وقت وہ قدم قدم پر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی آتی تھی۔ اب بڑی تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ خالی ہاتھ ہونے پر عذر کی گنجائش تھی۔ بھرے ہوئے ہاتھوں کے لیے کوئی عذر یا حیلہ نہ تھا۔

اپنے کمرہ میں پہنچتے ہی صوفیہ نے دروازہ بند کر دیا اور پردے ڈال دیئے۔ گرمی کی شدت سے سارا بدن پسینہ سے تر تھا۔ ہاتھ اس طرح کانپ رہے تھے جیسے رعشہ کا اثر ہو۔ وہ خطوط کو نکال نکال کر دیکھنے لگی اور خطوط کو محض دیکھنا نہ تھا۔ انہیں ان کی جگہوں پر ترتیب کے ساتھ رکھنا بھی تھا۔ خطوط کا ایک دفتر سامنے تھا۔ برسوں کے خطوط بہ حفاظت رکھے ہوئے تھے۔ صوفیہ کو تلاش کرتے گھنٹوں گزر گئے۔ دفتر ختم ہونے پر آ گیا۔ پر وہ چیز نہ ملی۔ اسے اب کچھ کچھ مایوسی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ آخری خط بھی الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا۔ اس وقت صوفیہ نے ایک لمبی سانس لی۔ صوفیہ کی حالت اس آدمی کی سی تھی جو کسی میلہ میں اپنے گم شدہ عزیز کو ڈھونڈتا ہو۔ وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔ اس کا نام لے کر زور زور سے پکارتا ہے۔ اس کو وہم ہوتا ہے کہ وہ کھڑا ہے۔ لپک کر اس کے پاس جاتا ہے اور شرمندہ ہو

کر واپس آتا ہے۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور رونے لگتا ہے۔

صوفیہ بھی رونے لگی۔ وہ خط کہاں گیا؟ رانی نے تو اس کو میرے سامنے ہی بیگ میں رکھ دیا تھا۔ ان کے اور بھی خطوط یہاں موجود ہیں۔ کیا اسے کہیں اور رکھ دیا؟ مگر امید اس گھاس کی مانند ہے جو گرمی کی حدت سے جل جاتی ہے۔ زمین پر اس کا نشان تک نہیں رہتا۔ زمین ایسی صاف سفید ہو جاتی ہے جیسے ٹکسال کا نیا روپیہ، لیکن بارش کی بوند پڑتے ہی پھر جلی ہوئی جڑیں پنپنے لگتی ہیں اور خشک جگہ پر ہریاول لہرانے لگتی ہے۔

صوفیہ کی امید پھر ہری ہوئی۔ کہیں میں کوئی خط چھوڑ تو نہیں گئی۔ اس نے خطوط کو دوبارہ دیکھنا شروع کیا اور زیادہ غور کے ساتھ ایک ایک لفافہ کو کھول کر دیکھنے لگی کہ کہیں رانی نے اسے کسی دوسرے لفافہ میں رکھ دیا ہو۔ جب دیکھا کہ اس طرح تو ساری رات گزر جائے گی تو انہیں لفافوں کو کھولنے لگی جو وزنی معلوم ہوئے۔ آخر یہ شک بھی رفع ہو گیا۔ اس لفافہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب امید کی جڑیں بھی سوکھ گئیں۔ بارش کا قطرہ نہ ملا۔

صوفیہ چارپائی پر لیٹ گئی گویا تھک گئی ہو۔ کامیابی جانفزا ہوتی ہے اور ناکامی جاں گسل۔ امید ایک نشہ ہے اور مایوسی اس نشہ کا خمار۔ نشہ میں ہم گھر سے باہر دوڑتے ہیں اور خمار کے وقت ہم گھر میں آرام کرتے ہیں۔ امید مادہ کی طرف لے جاتی ہے اور مایوسی روح کی طرف۔ امید آنکھیں بند کر دیتی ہے مایوسی آنکھیں کھول دیتی ہے امید سلانے والی تھپکی ہے۔ مایوسی جگانے والا چابک۔

صوفیہ کو اس وقت اپنی اخلاقی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے ناحق اپنی روح کو گناہ گار بنایا۔ کیا میں رانی سے اپنا خط نہ مانگ سکتی تھی۔ انہیں اس کے دینے میں ذرا بھی توقف نہ ہوتا۔ پھر میں نے وہ خط انہیں دیا ہی کیوں۔ رانی صاحبہ کو کہیں میری یہ باتیں معلوم ہو گئیں اور ضرور ہی معلوم ہو جائیں گی تو وہ میری بابت اپنے دل میں کیا

خیال کریں گی۔ غالباً مجھ سے زیادہ ذلیل اور کمینہ شخص دوسرا نہ ہوگا۔

دفعتاً صوفیہ کے کانوں میں جھاڑو لگنے کی آواز آئی۔ وہ چونک پڑی۔ کیا سویرا ہو گیا؟ پردہ اٹھا کر دروازہ کھولا تو دن نکل آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اس نے درد آمیز نگاہوں سے دستی بیگ کی طرف دیکھا اور بت کی طرح کھڑی رہ گئی۔ عقل نے جواب دے دیا۔ اپنی حالت اور کام پر ایسا غصہ آ رہا تھا کہ گردن پر چھری پھیر لوں۔ کون سا منہ دکھاؤں گی۔ رانی صاحبہ علی الصبح اٹھتی ہیں۔ مجھے ضرور ہی دیکھ لیں گی، لیکن اب اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ یا خدا! تو بیکسوں کا مددگار ہے۔ اب میری لاج تیرے ہی ہاتھ ہے۔ خدا کرے ابھی رانی صاحبہ نہ اٹھی ہوں۔ اس کی دعا میں کتنی عاجزی، کتنی مجبوری، کتنا درد، کتنی عقیدت اور کتنی غیرت تھی۔ شاید اس نے ایسی صاف دلی سے کبھی دعا نہ کی تھی۔

اب ذرا بھی دیر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے بیگ اٹھا لیا اور باہر نکلی۔ غرور کبھی اس قدر پامال نہ ہوگا۔ اس کے منہ میں سیاہی لگی ہوتی جب بھی شاید وہ اس طرح آنکھیں چراتی ہوئی نہ جاتی۔ کوئی شریف آدمی قیدی کی شکل میں بیڑیاں پہنے جاتا ہوا بھی اتنا خجل نہ ہوگا۔ جب وہ دیوان خانہ کے دروازہ پر پہنچی تو اس کا دل یوں دھڑکنے لگا گویا کوئی ہتھوڑا چلا رہا ہو۔ وہ ذرا دیر ٹھٹکی۔ کمرہ میں جھانک کر دیکھا۔ رانی بیٹھی ہوئی تھیں۔ صوفیہ کی اس وقت جو حالت ہوئی اس کا صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ گر گئی، کٹ گئی۔ سر پر بجلی گر پڑتی یا نیچے کی زمین پھٹ جاتی تو وہ بھی شاید اس بڑی مصیبت کے مقابلہ میں پھولوں کی بارش یا پانی کی چھینٹوں کی طرح خوش گوار معلوم ہوتی۔ اس نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے ہینڈ بیگ کو چپکے سے لے جا کر میز پر رکھ دیا۔ رانی نے اس کی طرف دل کو چھید ڈالنے والی نگاہ سے دیکھا۔ اس میں غصہ نہ تھا، رحم نہ تھا۔ حقارت تھی، خالص و زندہ اور بولتی ہوئی۔

صوفیہ لوٹنا چاہتی تھی کہ رانی نے پوچھا۔ ''کیا ونے کے خط کی جستجو تھی؟'' صوفیہ

ساکت و خاموش رہ گئی۔ معلوم ہوا کسی نے جگر پر خنجر چلا دیا۔

رانی نے کہا۔ ''اسے میں نے علیحدہ رکھ دیا ہے۔ کہو تو منگوا دوں۔''

صوفیہ نے جواب نہ دیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس کو کمرہ گھومتا ہوا معلوم ہوا۔

رانی نے تیسرا تیر چلایا۔ ''کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے؟''

صوفیہ غش کھا کر فرش پر گر پڑی۔

(14)

صوفیہ کو ہوش آیا تو وہ اپنے کمرہ میں پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں رانی کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے؟ وہ اپنے کو اس وقت اتنی حقیر سمجھ رہی تھی کہ گھر کا مہتر بھی اسے گالیاں دیتا تو شاید سر نہ اٹھاتی۔ وہ نفس کے ہاتھوں اس قدر پامال ہو چکی تھی کہ اسے اپنے سنبھلنے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ میرا دل مجھ سے وہ سب کچھ کرا سکتا ہے جس کے محض خیال سے انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ میں دوسروں پر کتنا ہنستی تھی۔ اپنی مذہبی رغبت پر کتنا فخر کرتی تھی۔ میں تناسخ اور نجات، خدا اور مادہ جیسے پیچیدہ مسائل پر غور و حوض کرتی تھی اور دوسروں کو خواہش اور خود غرضی کا غلام سمجھ کر ذلیل خیال کرتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ خدا سے قریب تر ہو گئی ہوں۔ دنیا کو ہیچ سمجھتے ہوئے میں اپنے کو نجات کا مستحق خیال کرتی تھی، لیکن آج میری عقیدت کا پردہ فاش ہو گیا۔ آہ و نے کو یہ باتیں معلوم ہوں گی تو وہ اپنے دل میں کیا سمجھیں گے۔ غالباً میں ان کی نگاہوں میں اتنی گر جاؤں گی کہ وہ مجھ سے بولنا پسند نہ کریں۔ میں بدنصیب ہوں۔ میں نے ان کو رسوا کیا اپنے خاندان کو بدنام کیا۔ اپنے ضمیر کا خون کیا اور اپنے میزبانوں کی فیاضی کی توہین کی۔ میرے سبب مذہب بھی بدنام ہو گیا ورنہ کیا آج مجھ سے یہ پوچھا جاتا، کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے؟

اس نے سرہانے کی طرف دیکھا۔ الماریوں پر مذہبی کتابیں قرینہ سے چنی ہوئی

تھیں۔ کتابوں کے دیکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ یہی میرے مطالعہ کا نتیجہ ہے! میں سچ کی کھوج کرنے چلی تھی اور اس بری طرح گری کہ اب اٹھنا مشکل ہے۔

سامنے دیوار پر مہاتما بدھ کی تصویر آویزاں تھی۔ ان کے چہرہ پر کتنا نور تھا۔ صوفیہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ندامت ہوئی تھی۔ بدھ کے زندہ جاوید ہونے کا اسے پہلے کبھی اتنا یقین نہ ہوا تھا۔ تاریکی میں لکڑی کا کنڈا بھی جاندار ہو جاتا ہے۔ صوفی کے دل پر ایسی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

ابھی نو بجے کا وقت تھا مگر صوفیہ کو گمان ہو رہا تھا کہ شام ہو رہی ہے۔ وہ سوچتی تھی کیا سارے دن سوتی رہ گئی۔ کسی نے مجھے جگایا بھی نہیں۔ کوئی کیوں جگانے لگا۔ یہاں اب میری پروا کس کو ہے اور کیوں ہو۔ میں بدذات ہوں۔ میری ذات سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے گا۔ جہاں رہوں گی وہیں آگ لگاؤں گی۔ میں نے بری ساعت میں اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ میرے ہاتھوں یہ گھر ویران ہو جائے گا۔ میں ونے کو اپنے ساتھ ڈبو دوں گی۔ ماں کی بددعا کا اثر ضرور ہوگا۔ خدایا آج میرے دل میں ایسے خیالات کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟

یکایک مسز سیوک کمرہ میں داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھتے ہی صوفیہ کو اپنے سینہ میں جذبات کا ایک سیلاب سا آتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ دوڑ کر ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔ وہی اب اس کا آخری سہارا تھا۔ یہیں اب اس کو وہ ہمدردی مل سکتی تھی جس کے بغیر اس کا زندہ رہنا دشوار تھا۔ یہیں اب اس کو وہ آرام، وہ سکون، وہ سایہ مل سکتا تھا جس کے لیے اس کی روح تڑپ رہی تھی۔ ماں کی گودی کے سوا یہ روحانی خوشی اور کہاں مل سکتی ہے۔ ماں کے سوا کون اسے چھاتی سے لگا سکتا ہے۔ کون اس کے دل پر مرہم رکھ سکتا ہے۔ ماں کی سخت کلامی اور اس کا دلآزارانہ سلوک یہ سب اسی خوشی کی خواہش کے جوش میں غائب ہو گئے۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ خدا نے میری بیکسی پر ترس کھا کر ماما کو یہاں بھیجا ہے۔ ماں کی گودی میں اپنے دکھتے ہوئے سر کو رکھنے پر

اس کو ایک بار پھر اس سکون اور تقویت کا احساس ہوا جس کی یاد اس کے دل سے اب تک محو نہ ہوئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، لیکن ماں کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ وہ تو مسٹر کلارک کی نوید کامژدہ جاں فزا سنانے کے لیے بے قرار ہوئی تھی۔ جوں ہی صوفیہ کے آنسو تھمے، مسز سیوک نے کہا۔ ''آج تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا، مسٹر کلارک نے تمہیں اپنے یہاں بلا بھیجا ہے۔''

صوفیہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کو ماں کی یہ بات بے موقع معلوم ہوئی۔

مسز سیوک نے پھر کہا۔ ''جب سے تم یہاں آئی ہو وہ کئی مرتبہ تمہاری خیر و عافیت کا حال دریافت کر چکے ہیں۔ جب ملتے ہیں تمہارا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔ ایسا شریف سوئیلین میں نے نہیں دیکھا۔ ان کی شادی کسی انگریز گھرانے میں ہو سکتی ہے اور یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ تمہیں ابھی تک یاد کرتے ہیں۔''

صوفیہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ ماں کی ثروت پسندی ناقابل برداشت تھی۔ نہ محبت کی باتیں ہیں نہ تشفی کے الفاظ۔ شاید حضرت یسوع نے بھی بلایا ہوتا تو یہ اتنا خوش نہ ہوتیں۔

مسز سیوک بولیں۔ ''اب تمہیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ توقف سے محبت سرد ہو جاتی ہے اور پھر اس پر کوئی چوٹ نہیں پڑ سکتی۔ ایسا سنہری موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ ایک دانا کا قول ہے کہ ہر شخص کو زندگی میں صرف ایک بار اپنی قسمت آزمائی کا موقع ملتا ہے اور وہی اس کے مستقبل کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ تمہاری زندگی میں یہ وہی موقع ہے۔ اسے کھو دیا تو ہمیشہ پچھتاؤ گی۔''

صوفیہ نے مغموم ہو کر کہا۔ ''اگر مسٹر کلارک نے مجھے مدعو نہ کیا ہوتا تو شاید آپ مجھ کو یاد بھی نہ کرتیں۔''

مسز سیوک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میرے دل میں جو کچھ ہے وہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ پر ایسا کوئی دن نہیں جاتا کہ میں تمہارے اور پربھو کے لیے خدا سے دعا نہ

کرتی ہوں۔ یہ انہیں دعاؤں کا اثر ہے کہ تمہیں یہ موقع نصیب ہوا ہے۔''

یہ کہہ کر مسز سیبوک رانی جانہوی سے ملنے گئیں۔ رانی صاحبہ نے ان کی کوئی خاص عزت نہیں کی۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بولیں۔ ''آپ سے بہت دنوں میں ملاقات ہوئی۔''

مسز سیبوک نے سوکھی ہنسی ہنس کر کہا۔ ''ابھی میری واپسی کی ملاقات آپ کے ذمہ باقی ہے۔''

رانی: آپ مجھ سے ملنے کے لیے آئیں کب؟ پہلے بھی صوفیہ سے ملنے آئی تھیں اور آج بھی۔ میں تو آج آپ کو ایک خط لکھنے والی تھی۔ اگر برا نہ مانیے تو ایک بات پوچھوں؟

مسز سیبوک: پوچھئے۔ برا کیوں مانوں گی۔

رانی: مس صوفیہ کی عمر تو زیادہ ہوگئی۔ آپ نے اس کے بیاہ کی فکر کی یا نہیں؟ اب تو اس کا جتنی جلدی بیاہ ہو جائے اتنا ہی اچھا۔ آپ لوگوں میں لڑکیاں بہت سیانی ہونے پر بیاہی جاتی ہیں۔

مسز سیبوک: اس کی شادی کب کی ہوگئی ہوتی۔ کئی انگریز بے طرح پیچھے پڑے۔ مگر یہ راضی ہی نہیں ہوتی۔ اس کو مذہبی کتب سے اس قدر دلچسپی ہے کہ شادی کو ایک جنجال سمجھتی ہے۔ آج کل حاکم ضلع مسٹر کلارک کے پیغامات آ رہے ہیں۔ دیکھوں اب بھی راضی ہوتی ہے یا نہیں۔ آج میں اس کو لے جانے ہی کے ارادہ سے آئی ہوں۔ میں ہندوستانی عیسائیوں سے رشتہ نہیں جوڑنا چاہتی۔ ان کا طرز معاشرت مجھے پسند نہیں ہے اور صوفی جیسی تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے کوئی انگریز شوہر ملنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوسکتی۔

رانی: میری رائے میں شادی ہمیشہ اپنے ہم قوم لوگوں میں کرنی چاہیے۔ یورپین لوگ ہندوستانی عیسائیوں کی کچھ بہت وقعت نہیں کرتے اور بے جوڑ شادیوں کا نتیجہ

اچھا نہیں ہوتا۔

مسز سیوک: (غرور سے) ایسا کوئی یورپین نہیں ہے جو میرے خاندان میں شادی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھے۔ ہم اور وہ ایک ہیں۔ ہم اور وہ ایک ہی خدا کو مانتے ہیں۔ ایک ہی گرجا میں عبادت کرتے ہیں اور ایک ہی نبی کی امت میں ہیں۔ ہمارا اور ان کا طرز معاشرت، رسم و رواج، خورد و نوش سب ایک ہیں۔ یہاں انگریزوں کی سوسائٹی میں، کلب میں، دعوتوں میں ہماری ایک سی عزت ہوتی ہے۔ ابھی تین چار روز ہوئے لڑکیوں کو انعام تقسیم کا جلسہ تھا۔ مسٹر کلارک نے خود مجھے اس جلسہ کا صدر بنایا اور میں نے ہی انعامات تقسیم کیے۔ کسی ہندو یا مسلمان لیڈی کو یہ اعزاز نہیں حاصل ہو سکتا۔

رانی: ہندو یا مسلمان جنہیں کچھ بھی اپنی ذات کا خیال ہے، انگریزوں کے ساتھ ملنا جلنا اپنے لیے عزت کا باعث نہیں خیال کرتے۔ یہاں تک کہ ہندوؤں میں جو لوگ انگریزوں کے ساتھ خورد و نوش رکھتے ہیں، انہیں لوگ حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ شادی بیاہ کا تو ذکر ہی کیا۔ سیاسی اقتدار کی بات اور ہے۔ ڈاکوؤں کی ایک جماعت عالموں کی ایک مجلس کو نہایت آسانی سے مغلوب کر سکتی ہے مگر اس سے علماء کی عزت کچھ کم نہیں ہوتی۔ ہر ہندو جانتا ہے کہ حضرت مسیح بدھ مت کے زمانہ میں یہاں آئے تھے اور انہوں نے یہیں تعلیم پائی تھی اور جو علم انہوں نے یہاں حاصل کیا ہے، اسی کی اشاعت مغرب میں کی۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ ہندو انگریزوں کو اپنے سے بہتر خیال کریں۔

دونوں عورتوں میں اسی طرح کی نوک جھونک ہوتی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی کچھ نیت کو سمجھتی تھیں۔ احسان مندی یا شکر گذاری کے الفاظ کسی کے منہ سے نہ نکلے۔ یہاں تک کہ جب مسز سیوک رخصت ہونے لگیں تو رانی ان کو پہنچانے کے لیے کمرہ کے دروازہ تک بھی نہ گئیں۔